29

کوشش کرو کہ تم اِس دنیا کی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو

(فرمودہ 9 ستمبر 1949ء بمقام لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"پہلے تو میں دوستوں سے یہ معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ آج یہاں آنے میں مجھے کچھ دیر ہوگئی ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب میں نماز کے لیے آنے لگا تو یکدم میری انتڑیوں میں تکلیف شروع ہوگئی اور آہستہ آہستہ یہ تکلیف اتنی بڑھ گئی اور درد اتنی شدت اختیار کر گیا کہ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ کہلا بھیجوں کہ نماز پڑھا دی جائے لیکن پھر خیال آیا کہ ممکن ہے یہ درد پیچش کی شکایت کی وجہ سے ہو اور اگر اِجابت ہو جائے تو درد دور ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد مجھے قضائے حاجت کا احساس ہوا اور گومروڑ کے ساتھ ہی اِجابت ہوئی مگر بہرحال درد کی جو شدت تھی وہ اِجابت کے بعد جاتی رہی اور میں اس قابل ہو گیا کہ جمعہ کے لیے آسکوں۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جیسا کہ احباب کو علم ہو چکا ہے اب ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم ربوہ چلے جائیں۔ ہمارے بہت سے دفاتر تو پہلے ہی ربوہ جا چکے ہیں۔ جو حصہ باقی رہ گیا تھا اس

کے متعلق اب ہمارا ارادہ ہے کہ وہ بھی ربوہ چلا جائے اور اس طرح ہم سب وہاں پہنچ کر ربوہ کی ترقی اور سلسلہ کی عمارتوں کی تعمیر کی طرف توجہ کریں۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ 31؍اگست 1947ء کو میں یہاں آیا تھا اور آج 9 ستمبر 1949ء ہے گویا دو سال آٹھ دن میرے اس قیام پر گزر گئے ہیں۔ کچھ دوستوں پر اس سے کم زمانہ گزرا ہے کیونکہ وہ بعد میں آئے تھے اور کچھ دوست جو پہلے آ گئے تھے ان پر اس سے زیادہ دن گزرے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مشیّت کے ماتحت ہم جتنے عرصہ تک یہاں رہے اس میں ہمیں کئی قسم کے تجارب حاصل ہوئے۔ قادیان کی رہائش کی وجہ سے جس طرح ہم دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے وہ بات یہاں نہیں تھی۔ یہاں لوگوں سے میل جول پیدا کرنے کے زیادہ مواقع تھے اور یہ ایک نیا تجربہ تھا جس نے ہمیں بہت سے نئے سبق دیئے۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آئندہ بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے منفی بھی اور مثبت بھی۔

میں اِس وقت دوستوں کی آگاہی کے لیے صرف یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے تو ہمارا ارادہ تھا کہ ہم پیر کے دن یہاں سے چلے جائیں مگر جیسا کہ احباب کو معلوم ہے میری بیوی اُمِّ متین کوئٹہ میں سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ وہاں علاج کے بعد کسی قدر آرام آ گیا تھا مگر یہاں آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے ایک ایسی بیماری کا شبہ پیدا کر دیا جو بہت خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ اس بیماری کے متعلق بعض ٹیسٹ ایسے کیے جانے ہیں جن کا نتیجہ پیر کے دن نکلے گا اس لیے اب اس نتیجہ کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ ہماری یہاں سے کب روانگی ہوگی۔ آج ہی ایک دوسرے ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیا گیا تھا۔ انہوں نے لیڈی ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق ظاہر نہیں کیا مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ چونکہ ڈاکٹرنی نے خود ملاحظہ کیا ہے اس لیے ٹیسٹ بہرحال ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ ہم یہاں سے کب روانہ ہوں۔ اگر خدانخواستہ لیڈی ڈاکٹر کی رائے درست ہوئی تو پھر آپریشن کی ضرورت ہوگی اور اگر آپریشن نہ بھی ہو تب بھی شعاعوں کے ذریعہ ایک لمبے عرصہ تک علاج کرانا پڑے گا۔ بہرحال اس پیر کو ہمارے جانے کا ارادہ ملتوی ہے۔ اس کے بعد دوسری تاریخ ڈاکٹری مشورہ سے مقرر کی جائے گی۔

میں جب جمعہ کے لیے آیا تو راستہ میں مَیں نے اتنی کثرت سے جماعت کے دوستوں کو نماز

کے انتظار میں بیٹھے دیکھا کہ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے دوست کہاں سے آ گئے ہیں۔ بعض نے کہا کہ چونکہ آپ کئی ماہ کے بعد آئے ہیں اس لیے لوگ زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا پہلے بھی تو میں یہیں جمعہ پڑھاتا رہا ہوں مگر اتنا اجتماع میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس مسجد میں بھی لوگ پہلے سے زیادہ سمٹ کر بیٹھے ہیں اور ان کی تعداد پہلے سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور باہر گلی بھی مسجد کی طرح بھری ہوئی ہے۔ اس غیر معمولی اجتماع کو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جس طرح مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ وہ جمعۃ الوداع کے دن خاص طور پر نماز پڑھنے کے لیے آ جاتے ہیں اِسی طرح چونکہ پیر کے دن ہماری روانگی کا پروگرام تھا لاہور والوں نے سمجھا کہ یہ آخری جمعہ تو ہم مسجد میں جا کر پڑھ آئیں۔ گویا یہ بھی لاہور والوں کا ایک جمعۃ الوداع ہے مگر اس سے اتنا پتا ضرور لگ گیا ہے کہ یہاں ہماری جماعت بہت زیادہ ہے اور جمعہ میں لوگ عام طور پر اتنے نہیں آتے جتنے کہ آنے چاہییں۔ بہرحال جیسا کہ میں نے بتایا ہے فی الحال پیر کے دن ہمارے جانے کی تجویز ملتوی ہے ممکن ہے ڈاکٹری مشورہ کے بعد اگلا جمعہ بھی مجھے یہیں پڑھانا پڑے اور اگر ایسا ہی ہوا تو لاہور والوں کے دو جمعۃ الوداع بن جائیں گے۔

میں نے سنا ہے کہ بعض دوسری مساجد میں بھی نمازیں ہوتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں آج کے اجتماع میں کچھ نہ کچھ دخل اس بات کا بھی ہے کہ بعض دوستوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دو سال کے بعد یہ واپس جا رہے ہیں۔ آؤ! آج تو ہم مسجد میں جا کر جمعہ پڑھ لیں۔ میں ایسے دوستوں کو نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ جب انہیں ایک دفعہ جمعہ پڑھنے کا موقع مل گیا ہے تو اب وہ ہمیشہ کے لیے جمعہ پڑھنے کی عادت ڈال لیں۔ اور اگر وہ کسی اَور جگہ جمعہ پڑھتے تھے تب بھی ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہ نہایت مستعدی سے جمعہ کی نماز ادا کیا کریں اور جو سُست ہوں اُن کو بھی اپنے ساتھ لایا کریں۔ مومن کی ایسی قربانی خدا تعالیٰ کے حضور کافی نہیں سمجھی جاتی۔ اسی شخص کی قربانی قبول ہوتی ہے جو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو نماز میں بار بار جمع کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔ نماز پڑھنے والا ایک فرد ہوتا ہے مگر وہ اِھْدِنِی کہنے کی بجائے دعا یہ مانگ رہا ہوتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ [1] اے خدا! تُو ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلا۔ پس دوستوں کو صرف اس بات پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ ہمیں اُس وقت

مطمئن ہونا چاہیے جب دوسرے لوگ بھی نماز پڑھنے لگ جائیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ صریح طور پر فرماتا ہے کہ مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اہل کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کرتا رہے۔2 سو احباب کو نماز کی پابندی کرنے اور نماز کی پابندی کروانے کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ یہ ایک علامت ہے جس سے پتا لگ سکتا ہے کہ تمہارے اندر کس قدر ایمان پایا جاتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی اپنے دل میں کس قدر تڑپ رکھتے ہو۔ میں تمہیں یہی نہیں کہتا کہ تمہیں فرض نمازوں کی پابندی اختیار کرنی چاہیے بلکہ میں تمہیں یہ بھی نصیحت کرتا ہوں کہ تمہیں فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کی بھی پابندی کرنی چاہیے تاکہ تمہارے قلب میں نور پیدا ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل ہو۔ آخر جو شخص احمدیت کو قبول کرتا ہے وہ اسی لیے قبول کرتا ہے کہ اس کا خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق بغیر نماز، روزہ اور ذکرِ الٰہی کی کثرت کے کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص احمدیت کو تو قبول کرتا ہے مگر اپنے اندر ایسا تغیر پیدا نہیں کرتا جس کے نتیجہ میں اسے خدا تعالیٰ نظر آنے لگ جائے، اس سے وہ کلام کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور اس سے محبت اور پیار کرے تو ایسی احمدیت کا کیا فائدہ۔ اور یہ چیزیں بغیر نمازوں اور نوافل اور ذکرِ الٰہی کی پابندی کے حاصل نہیں ہو سکتیں۔

آج ہی مولوی محمد ابراہیم صاحب بقاپوری کا اخبار میں ایک مضمون چَھپا ہے جس میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ اطمینانِ قلب حاصل کرنے کا یہی طریق ہے کہ صبر اور استقلال کے ساتھ ذکرِ الٰہی اور نمازوں پر زور دیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں وہ جِلا پیدا ہوگی جس سے تم بدیوں پر غالب آسکو گے اور خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ یہی چیز ہے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ اگر یہ جلا تمہارے دلوں میں پیدا نہ ہوئی تو تمہاری زندگی کیسی اور ایمان کا دعوٰی کیسا؟ پس کوشش کرو کہ تم اس دنیا کی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ مرنے کے بعد خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی امید کوئی اطمینان بخش بات نہیں کہلا سکتی۔ اگر انسان مرنے لگے اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ نہ معلوم میں دوزخ میں ڈالا جاؤں گا یا جنت میں تو اس کی موت کتنے دکھ کی موت ہوگی۔ کتنا غم اس پر چھایا ہوا ہوگا اور کس طرح وہ ایک بے چینی اور خلش اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ سُکھ والی موت وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو

حاصل ہوئی۔ احادیث میں آتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو بار بار آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے تھے کہ اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی اِلَی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی۔[3] چلو سب سے بڑے دوست کے پاس چلیں۔ چلو سب سے بڑے دوست کے پاس چلیں۔

یہی حال صحابہؓ کا تھا۔ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنے پر اتنے خوش ہوتے تھے اور اس قدر لذّت اور سرور محسوس کرتے تھے کہ ان کے واقعات پڑھ کر حیرت آتی ہے۔ تاریخوں میں آتا ہے ایک جنگ کے موقع پر ایک عیسائی سردار نے کئی بڑے بڑے مسلمان سرداروں کو مار ڈالا۔ اُس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ عام حملہ سے پہلے دونوں لشکروں میں سے ایک ایک آدمی نکلتا اور وہ آپس میں مقابلہ کرتے۔ وہ عیسائی چونکہ ایک بڑا ماہر جرنیل تھا اس لیے انفرادی مقابلہ میں اس نے یکے بعد دیگرے کئی مسلمان مار ڈالے۔ آخر حضرت ابوعبیدہؓ نے جو اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف تھے حضرت ضرارؓ کو حکم دیا کہ وہ اس عیسائی کے مقابلہ کے لیے جائیں۔ جب وہ مقابلہ کے لیے نکلے اور اس عیسائی سردار کے سامنے کھڑے ہوئے تو بجائے اس کے کہ اس کا مقابلہ کرتے بے تحاشا میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور دوڑتے ہوئے اپنے خیمہ کی طرف چلے گئے۔ اِس پر عیسائیوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انہوں نے بڑے زور سے نعرے بلند کیے اور مسلمان جو پہلے ہی افسردہ خاطر ہو رہے تھے ان کی سخت دل شکنی ہوئی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے جب یہ نظارہ دیکھا تو انہوں نے ایک شخص کو جو حضرت ضرارؓ کے دوست تھے بلایا اور کہا تم ضرار کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ تم نے یہ کیا حرکت کی ہے؟ وہ خیمہ کے قریب پہنچے تو اتنے میں حضرت ضرارؓ خیمہ میں سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے جاتے ہی کہا ضرار! آج تم نے کیا کیا؟ سارے مسلمانوں کے سر آج شرمندگی اور ندامت کے مارے جھکے ہوئے ہیں اور وہ کفار کے سامنے اپنی گردنیں اونچی کرنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ کتنی بڑی ذلّت کی بات ہے کہ تم عیسائی سردار کے سامنے ہوتے ہی میدان چھوڑ کر خیمہ کی طرف بھاگ آئے اور کفار کو خوش ہونے کا موقع بہم پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ہمیشہ زِرہ کے بغیر لڑا کرتا ہوں مگر آج اتفاقاً صبح سے میں نے زِرہ پہنی ہوئی تھی۔ جب ابوعبیدہؓ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس عیسائی جرنیل کے مقابلہ کے لیے نکلوں تو میں بغیر خیال کیے زِرہ پہنے اس کے سامنے چلا گیا مگر جونہی میں سامنے کھڑا ہوا مجھے یاد آیا کہ میں نے زِرہ پہنی ہوئی ہے۔ اس پر میرے نفس نے

مجھے ملامت کی اور کہا ضرار! معلوم ہوتا ہے تُو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مرنے سے ڈرتا ہے اور شاید زِرہ تُو نے اس لیے پہن رکھی ہے کہ یہ بڑا مشہور جرنیل ہے اور کئی مسلمانوں کو شہید کر چکا ہے۔ اگر تُو نے زِرہ اتار دی تو ایسا نہ ہو کہ تجھے بھی یہ شخص مار ڈالے۔ یہ خیال میرے دل میں آیا ہی تھا کہ میں دوڑ کر اپنے خیمہ کی طرف چلا گیا اور میں نے سمجھا کہ اگر اِس وقت میں مارا گیا اور اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ ضرار! تم نے زِرہ کیوں پہن رکھی تھی؟ معلوم ہوتا ہے تمہیں ہم سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اگر شوق ہوتا تو اس طرح موت سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کیوں کرتے۔ تو میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکوں گا۔ میرے لیے سوائے ندامت اور شرمندگی کے اَور کوئی چارہ نہیں ہوگا اور میری موت مومنوں والی موت نہیں ہوگی۔ پس میں دوڑتے ہوئے اپنے خیمہ میں گیا اور میں نے زِرہ اتار دی تا کہ اگر میں مروں تو میں اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ چنانچہ اب میں بغیر زِرہ کے لڑنے کے لیے جا رہا ہوں اور میں مطمئن ہوں کہ اگر میں مرا تو میں اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ نہیں ہوں گا۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اِسی دنیا میں ہی خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا تھا اور وہ اسکی ملاقات کے لیے ہر وقت بیتاب رہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ موت ایک پُل ہے جس پر سے گزر کر ہم اپنے محبوب سے ملتے ہیں۔ اس لیے موت سے ڈرنے اور گھبرانے کے کوئی معنی ہی نہیں اور یہی ایمان کا اصل مقام ہوتا ہے۔ اس مقام کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ انسان نمازوں کی پابندی اختیار کرے، نوافل پڑھے، تہجد کی عادت ڈالے، ذکرِ الٰہی کرے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی یہ سمجھنے لگے کہ یہ شخص ہمارا عاشق ہے۔ اور جب کوئی شخص عاشق بن جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کا قرب ضرور حاصل ہو کر رہتا ہے۔ سو آپ لوگ جو یہاں آئے ہوئے ہیں میں آپ لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نمازوں کی عادت ڈالیں۔ آج کا ہجوم بتاتا ہے کہ لاہور میں ہماری جماعت کے احباب بہت کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ پس آپ لوگوں میں سے جو سُست ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ تم نمازوں کی پابندی کی عادت ڈالو۔ اور جو سُست نہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ تم دوسروں کو بیدار کرنے کی کوشش کرو۔ تا کہ کوئی فرد بھی ایسا نہ رہے جو نمازوں اور نوافل اور ذکرِ الٰہی میں سُست ہو۔ بلکہ جمعہ پڑھنا تو الگ چیز ہے، فرض نمازوں کی پابندی بھی الگ چیز ہے میں تو یہ کہتا ہوں ہر احمدی کو ان عبادات اور ذکرِ الٰہی کی طرف اس قدر توجہ رکھنی چاہیے کہ غیر شخص ہمیں دیکھتے ہی اس یقین پر پہنچ جائے کہ چونکہ یہ احمدی ہے اس لیے

جمعہ یا فرض نمازوں کا تو کیا کہنا ہے یہ تہجّد کے لیے بھی با قاعدہ اُٹھتا ہوگا اور راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا تا اور دعائیں کرتا ہوگا۔ اگر یہ چیز صحیح طور پر پیدا ہو جائے تو بد دیانتی، جھوٹ، ظلم، دھوکا، فریب اور ایذا رسانی وغیرہ کئی قسم کے گناہوں پر انسان بڑی آسانی سے غالب آ سکتا ہے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ مومن اپنے نشانات سے پہچانے جاتے ہیں یہ نشانات عبادت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔4 دیانتداری سے انسانی جسم پر کوئی نشان نہیں پڑتا، انصاف سے انسانی جسم پر کوئی نشان نہیں پڑتا لیکن نماز پڑھی جائے تو اس سے نشان پڑ جاتا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ نماز کے اندر ساری نیکیاں آ جاتی ہیں۔ جو شخص نماز کا پابند ہوگا وہ آہستہ آہستہ ہر قسم کے گناہوں پر غالب آ جائے گا اور اس کے اندر ایسا تقوٰی پیدا ہو جائے گا جو اسے نیکی کے راستہ پر چلاتا چلا جائے گا۔ پس نمازوں کی پابندی اختیار کرو اور سمجھ لو کہ یہی ایک چیز ہے جو مومنوں کی امتیازی علامت ہے اور جس کے بعد ان پر ایسا نشان پڑ جاتا ہے جو ان کے ایمان کی ایک نمایاں علامت ہوتی ہے۔ نماز پڑھی جائے تو اس کا انسانی جسم پر ایک تو ظاہری نشان پڑتا ہے اور ایک باطنی نشان پڑتا ہے۔ ظاہری نشان یہ ہے کہ ماتھے اور ناک پر مٹی وغیرہ لگ جاتی ہے اور باطنی نشان یہ ہے کہ چہرہ سے اللہ تعالیٰ کے عشق اور اس کی محبت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ پس دوسری بات جس کی طرف میں جماعت کے دوستوں کو خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نمازوں کی عادت ڈالو، ذکرِ الٰہی کی عادت ڈالو، نوافل کی عادت ڈالو، تہجد پڑھنے کی عادت ڈالو اور پھر ان عادتوں کو اتنا راسخ کرو کہ ہر شخص کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ جو شخص احمدیت میں داخل ہو جائے وہ نمازوں اور نوافل اور ذکرِ الٰہی کا پابند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تیسری بات جس کی طرف میں یہاں کے دوستوں کو بھی مگر زیادہ تر باہر کی جماعتوں کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم الاسلام کالج لاہور میں دو سال سے قائم ہے اور ابھی ایک دو سال تک جب تک کہ ہم کالج کی عمارت تیار نہ کر لیں لاہور میں ہی رہے گا۔ اس کالج کے قائم کرنے سے ہماری غرض یہ تھی کہ احمدی طلباء ایک جگہ اکٹھے رہیں اور احمدی اساتذہ سے ہی تعلیم حاصل کریں تا کہ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے اندر دینی روح بھی ترقی کرتی چلی جائے اور وہ سلسلہ کے لیے مفید وجود ثابت ہوں۔ مگر یہ فائدہ تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب باہر سے

طالب علم آئیں اور ہمارے کالج میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کریں۔ خالی کالج بنا دینے سے ہماری غرض پوری نہیں ہوسکتی۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ باہر سے بکثرت طلباء آئیں اور تعلیم الاسلام کالج میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کو مکمل کریں۔

ابھی چند دن ہوئے مجھے ایک جاہل نے خط لکھا ہے جو کالج کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اتفاقاً یاد آ گیا۔ اس خط میں اس نے بہت سے اعتراضات کیے ہیں جن میں سے ایک اعتراض اس نے یہ بھی کیا ہے کہ ناصر احمد کو کالج کا پرنسپل کیوں بنایا گیا ہے؟ اسے باہر کسی ملک میں تبلیغ کے لیے کیوں نہیں بھیج دیا جاتا؟ اس کی جگہ تو ایک عیسائی بھی پرنسپل رکھا جا سکتا ہے اور وہ ناصر احمد سے زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے۔ یہ لکھنے والے کی کمال درجہ کی جہالت ہے کہ طالب علم جس کی زندگی ایک نہایت ہی قیمتی چیز ہوتی ہے اور جس کی حفاظت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس کو وہ کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ سمجھتا ہے کہ ایک عیسائی پرنسپل بھی لڑکوں کی اس طرح تربیت کر سکتا ہے جس طرح ناصر احمد کر رہا ہے۔ اوّل تو مالی نقطہ نگاہ سے ہی کوئی اَور پرنسپل رکھا جائے تو وہ ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار سے کم نہیں لے گا۔ لیکن اگر اس فائدہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اگر ہم نے ہندو اور عیسائی ہی پرنسپل اور پروفیسر رکھنے ہیں تو پھر ہمیں اپنا الگ کالج بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرے کالجوں میں بھی عیسائی پروفیسر اور پرنسپل ہیں ان میں داخل ہو کر لڑکے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری غرض تو اس کالج کو الگ قائم کرنے سے یہ ہے کہ احمدی طلباء احمدی اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے احمدیت کی روح اپنے اندر پیدا کریں اور یہ روح نہ کسی دوسرے کالج میں پڑھ کر پیدا ہوسکتی ہے نہ عیسائی پرنسپل رکھ کر پیدا ہوسکتی ہے۔ اس روح کے پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنا کالج ہو، اپنا ماحول ہو اور اپنے اساتذہ کی زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت کا کام ہو تا کہ ہماری آئندہ نسل اسلام اور احمدیت کے لیے کارآمد وجود ثابت ہو۔

گزشتہ فسادات کی وجہ سے ہمارے کالج کے نتائج اچھے نہیں نکلے تھے مگر اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمارے کالج کا نتیجہ غیر معمولی طور پر نہایت شاندار رہا ہے جس سے پتا لگتا ہے کہ گزشتہ سال کے نتائج کی خرابی ان حالات کی وجہ سے تھی جو 1947ء میں پیدا ہوئے۔ اس سال ہمارے تعلیم الاسلام کالج کی ایک جماعت کا نتیجہ 90 فیصدی کے قریب رہا ہے جو ایک حیرت انگیز امر ہے

حالانکہ یونیورسٹی کی اوسط 39 فیصدی ہے۔ یہی حال اَور جماعتوں کے نتائج کا ہے۔ کوئی ایک جماعت بھی ایسی نہیں جس کا نتیجہ یونیورسٹی کی اوسط سے کم ہو بلکہ ہر جماعت کا نتیجہ یونیورسٹی کی اوسط سے بڑھ کر ہے۔ اگر کسی کلاس کے متعلق یونیورسٹی کی اوسط 35 فیصدی ہے تو ہمارے کالج کی اوسط ساڑھے سینتیس فیصدی ہے۔ یا اگر یونیورسٹی کی اوسط 35 فیصدی ہے تو ہمارے کالج کی 39 فیصدی ہے اور ایک کلاس کے متعلق تو میں نے بتایا ہے کہ ہمارے کالج کا نتیجہ اس میں 90 فیصدی کے قریب ہے حالانکہ یونیورسٹی کی اوسط اس سے بہت کم ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں یہ شبہات ہوا کرتے تھے کہ ہمارے کالج میں لڑکوں کی تعلیم کا زیادہ بہتر انتظام نہیں اب ان نتائج کے بعد ان کے شبہات دور ہو جانے چاہییں کیونکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہمارے کالج کے نتائج سوائے ایک کے باقی تمام کالجوں سے زیادہ شاندار نکلے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لیے فوراً تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرنے کی کوشش کریں۔ اس بارہ میں کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی سے کام نہ لیں۔ اس کالج میں اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے بھجوانا اس قدر ضروری اور اہم چیز ہے کہ میں تو سمجھتا ہوں جو شخص اپنے بچوں کو باوجود موقع میسّر آنے کے اس کالج میں داخل نہیں کرتا وہ اپنے بچوں کی دشمنی کرتا اور سلسلہ پر اپنے کامل ایمان کا ثبوت مہیا نہیں کرتا۔ اگر وہ کسی اَور جگہ اپنے بچوں کو داخل کرے گا تو صرف اس لیے کہ فلاں بورڈنگ اچھا ہے یا فلاں جگہ کھانا زیادہ اچھا ملتا ہے یا فلاں جگہ غیر قوموں کے لوگوں سے ملنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ حالانکہ اصل چیز تعلیم ہے، اصل چیز دینی تربیت اور اعلیٰ اخلاق کا حصول ہے اور یہ چیزیں تعلیم الاسلام کالج کے سوا کسی اَور کالج میں زیادہ بہتر طریق پر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تعلیم الاسلام کالج کی غرض یہ ہے کہ لڑکوں کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم بھی دی جائے اور یہ تعلیم کسی اَور جگہ نہیں دی جاتی۔ پس باہر کی جماعتوں کو اس بارہ میں اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے بچوں کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے دیکھا ہے بعض دفعہ لڑکے بھی غلط قدم اُٹھا لیتے ہیں اور وہ اپنے ماں باپ کو صحیح حالات سے بے خبر رکھتے ہوئے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل بچپن کی عمر ہی ایسی ہے کہ اس میں انسانی عقل پختہ نہیں ہوتی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے بچہ کئی دفعہ ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جو واقعات کے خلاف ہوتی ہیں اور اس طرح ماں باپ دھوکا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے ہیں

اَلصَّبِیُّ صَبِیٌّ وَلَوْ کَانَ نَبِیًّا بچہ بچہ ہی ہے خواہ اس نے بعد میں نبی ہی کیوں نہ بن جانا ہو۔ بہرحال لڑکے بعض دفعہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں جن سے ماں باپ دھوکا میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک نوجوان جو آجکل بڑا مخلص اور فدائی احمدی ہے اُسے طالب علمی کے زمانہ میں والدین نے قادیان میں داخل کروایا۔ یہ حضرت خلیفہ اوّل کے زمانہ کی بات ہے۔ ایک دن میں حضرت خلیفہ اول کے پاس گیا تو ابھی میں وہاں بیٹھا ہی تھا کہ اوپر سے ڈاک آ گئی اور آپ نے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ڈاک پڑھتے پڑھتے آپ نے ایک خط نکالا اور اسے پڑھ کر آپ ہنسے۔ اُس وقت ایک طرف میں بیٹھا تھا اور دوسری طرف وہ لڑکا بیٹھا تھا۔ آپ نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا میاں! تم اس لڑکے کو جانتے ہو؟ مجھے یاد نہیں میں نے اُس وقت کیا جواب دیا۔ (اُس لڑکے کے والد بہت پرانے صحابی تھے اور انہوں نے پہلے دن لدھیانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیعت کی تھی)۔ بہرحال اس گفتگو کے بعد حضرت خلیفہ اول اُس لڑکے کی طرف مخاطب ہوئے اور ہنس کر فرمانے لگے میاں! آج تم میرے پاس کس طرح پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا حضور! جس طرح میں پہلے حاضر ہوا کرتا تھا اُسی طرح آج بھی حاضر ہو گیا ہوں۔ آپ فرمانے لگے تم یہ بتاؤ کہ تم پنجرے میں سے کس طرح نکلے ہو؟ اِس پر اُس کا رنگ زرد ہو گیا اور شرمندگی اور ندامت کی وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر آپ نے وہ خط مجھے پڑھنے کے لیے دے دیا۔ میں نے پڑھا تو اُس میں لڑکے کی نانی نے حضرت خلیفہ اول کو لکھا تھا کہ میرے نواسے نے قادیان سے مجھے لکھا ہے کہ جب سے میں یہاں آیا ہوں مجھے انہوں نے ایک پنجرے میں ڈال کر لٹکا رکھا ہے۔ صبح شام سُوکھی روٹی اور ذرا سا پانی اس پنجرے میں رکھ دیتے ہیں جس پر میں گزارا کرتا ہوں۔ لڑکے اِدھر اُدھر سے آتے اور مجھے دیکھ کر ہر وقت مذاق کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ کو یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر آپ مجھے دیکھنا چاہتی ہیں تو خدا کے لیے آپ مجھے جلدی بُلوا لیں اور اس قید سے نجات دلوائیں۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت خلیفہ اول نے اس سے فرمایا کہ میاں! تم آج پنجرے میں سے کس طرح باہر آ گئے ہو؟

اِسی طرح میرے ساتھ ایک واقعہ ہوا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے میرے پاس شکایت کی کہ میرے لڑکے کو استاد نے عربی میں فیل کر دیا ہے حالانکہ وہ اس مضمون میں بہت ہوشیار تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد نے میرے لڑکے سے کوئی چیز لانے کے لیے کہا تھا چونکہ اس نے ایسا نہ کیا اس لیے

اس نے لڑکے کو فیل کر دیا۔ میں نے کہا میں یہ مان نہیں سکتا کہ ایک احمدی استاد اس قسم کی کمینہ حرکت کرے۔ یہ تو میں مانتا ہوں کہ سارے احمدی نیک نہیں مگر جو مثال میرے سامنے پیش کی گئی ہے وہ ایسی ہے کہ میرا دل نہیں مانتا کہ کوئی احمدی ایسی حرکت کر سکے۔ انہوں نے کہا آپ بیشک تحقیق کر لیں۔ لڑکے کو بِلا وجہ فیل کیا گیا ہے حالانکہ وہ بہت لائق اور ہوشیار تھا۔ میں نے کہا اچھا میں آپ کی خاطر سکول سے پرچہ منگواتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کیا بات ہے۔ مگر آپ پہلے وعدہ کریں کہ اگر یہ بات غلط ہوئی تو آپ لڑکے کو سخت سزا دیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا اور میں نے ہیڈ ماسٹر کو رقعہ لکھا کہ اگرچہ قاعدہ کی رو سے ایسا نہیں چاہیے مگر جماعتی نظام کی خاطر میں چاہتا ہوں کہ آپ فلاں لڑکے کا عربی کا پرچہ میرے پاس بھجوا دیں کیونکہ میرے پاس شکایت کی گئی ہے کہ اسے بِلا وجہ فیل کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے پرچہ بھجوا دیا۔ پرچہ آیا تو میں نے دیکھا کہ ممتحن نے اسے اڑھائی نمبر دیئے ہوئے تھے مگر جب میں نے پرچے کو کھول کر دیکھا تو میں اس استاد کی عقل پر حیران ہوا جس نے اسے اڑھائی نمبر دیئے تھے کیونکہ میرے نزدیک وہ اڑھائی نمبروں کا مستحق نہیں تھا صرف صفر کا مستحق تھا۔ چنانچہ میں نے اس لڑکے کے باپ کو لکھا کہ میں اس استاد کی عقل پر حیران ہوں جس نے اس لڑکے کو سَو میں سے اڑھائی نمبر دے دیئے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ صفر کا مستحق تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ استاد کو شرم آئی کہ صفر نمبر کیا دینا ہے چلو اڑھائی نمبر ہی دے دیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے کیا پتا تھا کہ میرے لڑکے نے مجھے اس طرح دھوکا دیا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔

بہرحال جب ایک طرف بالغ، عاقل اور سمجھدار اساتذہ ہوں اور دوسری طرف ناتجربہ کار بچہ ہو تو عقلمند انسان کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ مقابلہ کے وقت اپنے بچے کو غلطی پر سمجھے اساتذہ کو بددیانت اور نالائق قرار نہ دے۔ بعض دفعہ لڑکے اسی بات کو دیکھ کر کہ سینما دیکھنے پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں یا نمازوں وغیرہ کی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے کالج کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں اور یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ پروفیسر لڑکوں کو پڑھاتے نہیں وہ سارا دن اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔ اور جب یہ بات باپ سنتا ہے تو کہتا ہے اچھا! میرے بچہ پر یہ یہ مصیبتیں آ رہی ہیں اور پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ اسے کسی اَور کالج میں داخل کرا دے۔ میرے نزدیک ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اس قسم کی باتوں میں نہ آئیں اور اپنی عقل اور سمجھ سے کام لیں۔ آخر یہ موٹی بات ہے کہ تم اپنے بچوں کی

بات پر زیادہ اعتبار کرو گے یا یونیورسٹی کے نتائج پر زیادہ اعتبار کرو گے۔ یونیورسٹی کا نتیجہ بتا رہا ہے کہ ہمارے کالج کی ہر کلاس کا نتیجہ یونیورسٹی کی اوسط سے اوپر رہا ہے۔ ایک کا نتیجہ 90 فیصدی کے قریب رہا ہے اور دوسری کلاسوں کا نتیجہ یونیورسٹی کی اوسط سے اوپر رہا ہے اور یہ ایک نہایت ہی خوشکن بات ہے؟ مگر پھر بھی بعض لوگ ان حقائق پر غور کرنے کی بجائے لڑکوں کی بات پر کان رکھنے کے زیادہ عادی ہوتے ہیں۔

ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کہتے ہیں کہ کوئی سادہ لوح آدمی تھا جس کی طبیعت میں شرم اور حیا کا مادہ بہت غالب تھا۔ اس نے ایک گدھا خریدا۔ عربوں میں گدھے رکھنے کا عام رواج تھا اور وہ اس سے سواری اور بار برداری کا کام لیا کرتے تھے۔ جب اس کے دوستوں کو پتا لگا کہ اس نے گدھا خریدا ہے تو وہ روزانہ اس کے پاس آتے اور گدھا مانگ کر لے جاتے۔ اس طرح مہینہ دو مہینے گزر گئے اور وہ ایک دن بھی گدھا اپنی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال نہ کر سکا۔ ہر وقت وہ دوسروں کے پاس ہی رہتا۔ آخر تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اب میں کسی کو گدھا نہیں دوں گا۔ مگر ادھر طبیعت میں نرمی بھی تھی اور انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس کے پاس کوئی دوست آیا اور اس کے گھر کے باہر سے آواز دے کر کہا بھائی صاحب! مجھے گدھا چاہیے اگر آپ دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ اس نے چونکہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں کسی کو گدھا نہیں دوں گا اس لیے اس نے مکان کی چھت پر سے ہی اسے جواب دیا کہ آپ کی بات کو میں ردّ تو نہیں کر سکتا تھا مگر فلاں دوست آئے تھے اور وہ مجھ سے گدھا مانگ کر لے گئے اس لیے میں آپ کے مطالبہ کو پورا کرنے سے قاصر ہوں۔ اِدھر اس نے یہ بات کہی اور اُدھر گھر کے صحن سے گدھے نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سن کر دوست کہنے لگا عجیب بات ہے گھر سے گدھے کے چیخنے کی آواز آ رہی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں گدھا کوئی دوست لے گیا ہے۔ وہ کہنے لگا آپ بھی عجیب آدمی ہیں کہ میری بات پر اعتبار نہیں کرتے اور گدھے کی بات پر اعتبار کر رہے ہیں۔ یہ ہے تو لطیفہ مگر ان لوگوں کی حالت بالکل ایسی ہی ہے۔ وہ یونیورسٹی کی بات پر اعتبار نہیں کرتے اور اپنے بچے کی بات پر اعتبار کر لیتے ہیں۔

پس میں دوستوں کو خواہ وہ مقامی ہوں یا بیرونی جماعتوں سے تعلق رکھتے ہوں توجہ دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم الاسلام کالج میں اپنے لڑکوں کو داخل کرنے کی کوشش کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں

تعلیم الاسلام کالج کے عملہ کو بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک انہیں اپنے نتائج اس سے بھی بہتر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آخر قربانی ایک طرف سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ ہم جو اپنے عزیزوں اور جماعت کے دوستوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کراؤ تو لازمی طور پر اس کے نتیجہ میں ان کے دل کے گوشوں سے بھی یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اگر ہم سے قربانی کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو آپ لوگوں کا بھی فرض ہے کہ ہمارے لیے قربانی کریں۔ اگر پرنسپل اور کالج کے پروفیسر لڑکوں کے ساتھ محبت اور پیار کا تعلق رکھتے ہیں اور ان کی تعلیم کو اعلیٰ معیار تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اخلاق کی نگرانی رکھتے ہیں، ان کی صحت کو درست رکھنے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں، ان کے اندر ذہانت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ماں باپ اور لڑکوں دونوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ صرف ہم نے ہی قربانی نہیں کی بلکہ یہ لوگ بھی ہمارے لیے قربانی کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت میں ذاتی طور پر جماعت کو مخاطب کر کے تحریک کر رہا ہوں کہ وہ کالج کی طرف توجہ کریں اور اپنے لڑکوں کو اس میں تعلیم کے لیے بھجوائیں مگر بہرحال میں یہ آواز انہی کی طرف سے اٹھا رہا ہوں۔ میں تو کالج کا پرنسپل نہیں نہ پروفیسر یا مینیجر ہوں۔ میں جو آواز اٹھا رہا ہوں وہ انہی کی طرف سے اٹھا رہا ہوں۔ اور جب میں دوستوں کو تحریک کرتا ہوں کہ وہ اس کالج میں اپنے لڑکے بھجوائیں تو درحقیقت میں ایک رنگ میں ان کی زبان بن جاتا ہوں اور ان کی طرف سے جماعت کے دوستوں کو یہ کہتا ہوں کہ تم کالج کے لیے قربانی کرو اور اپنے لڑکوں کو اس میں داخل کرو۔ اور جب میں دوسروں کو قربانی کے لیے کہتا ہوں تو ان لوگوں کا بھی حق ہے کہ وہ آپ سے یہ پوچھیں کہ آپ ہمارے لیے کیا قربانی کر رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ ایک جائز مطالبہ ہے جو ان کی طرف سے ہوسکتا ہے اس لیے کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں کو چاہیے کہ وہ دوسروں سے زیادہ وقت کالج کی ترقی اور لڑکوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے صَرف کرنے کی عادت ڈالیں اور ان کو زیادہ سے زیادہ دینی احکام کا پابند اور اخلاقِ فاضلہ سے مُتّصِف بنائیں۔ خصوصاً لڑکوں کی خوراک کی طرف زیادہ توجہ رکھنی چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ انہیں اچھی اور عمدہ غذا میسر آئے۔ میں کچھ عرصہ سے مختلف کتب کے مطالعہ کے نتیجہ میں اور کچھ اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بچوں کی خوراک کا خیال نہ رکھنا اور ان کے لیے صحیح اور اعلیٰ درجہ کی غذا مہیا نہ کرنا ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ کئی

بیماریاں اس وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں کہ لڑکوں کی خوراک کا خیال نہیں رکھا جاتا۔اس میں کبھی تو غفلت کا دخل ہوتا ہے اور کبھی عدمِ علم کی وجہ سے خوراک کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً جب ہم بچے تھے اور اس زمانہ میں چونکہ خوراک کی قدر و قیمت کا لوگوں کو صحیح علم نہیں تھا اس لیے عدمِ علم کی وجہ سے ہماری غذا میں بعض نقائص رہ جاتے تھے۔ مثلاً مجھے یاد نہیں کہ ہمیں باقاعدہ ناشتہ ملا ہو۔ دودھ گھر میں ہوتا تھا جس کا دل چاہا اس نے پی لیا۔سکول سے پہلے کھانے کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔سکول سے وقت بچا کر کھانے کے لیے آجاتے تھے جس کے معنے ہیں کہ بے قاعدہ کھانا کھانا پڑتا تھا۔ اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری مائیں نَعُوْذُ بِاللّٰہِ ہماری دشمن تھیں۔انہیں ہم سب سے محبت بھی تھی، پیار بھی تھا۔ وہ ہمارے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے بھی تیار رہتی تھیں لیکن چونکہ انہیں علم نہیں تھا کہ ناشتہ ایک ضروری چیز ہے اور کھانا وقت پر کھانا ضروری ہے انہوں نے نہ ناشتہ کا خاص خیال رکھا اور نہ صبح سکول جانے سے پہلے کھانے کا انتظام کیا۔ بہرحال خوراک کا اعصاب پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ یورپین لوگ بڑی بڑی مشکلات کے باوجود اپنے حوصلے بلند رکھتے ہیں کیونکہ بچپن سے ہی انہیں اچھی اور وقت پر خوراک ملتی ہے لیکن ہمارے ملک کے لوگ بہت جلد اپنا حوصلہ ہار دیتے ہیں۔ان کا حوصلہ ہارنا اخلاق کی کمی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں اتنی طاقت ہی نہیں ہوتی کہ وہ حوادث اور آفات کا مقابلہ کر سکیں۔ پس بچوں کی خوراک کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ انہیں اچھی سے اچھی غذا میسّر آسکے۔ میں نے دیکھا ہے گھر میں کھانے کا انتظام ہوتا ہے تو آدھی رقم میں نہایت اعلیٰ درجے کا کھانا تیار ہو جاتا ہے۔ میرے بعض بچے اس وقت بورڈنگ میں رہتے ہیں اور ان کے ماہوار اخراجات کا مجھے علم ہے۔

وہی منافق جس نے یہ لکھا تھا کہ پرنسپل تو ایک عیسائی بھی رکھا جا سکتا ہے اُسی نے یہ بھی لکھا تھا کہ تمہارے اپنے دو لڑکے دوسرے کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور تم دوسروں سے یہ کہتے ہو کہ اپنے بچوں کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرو۔ میں اس کا بھی جواب دے دیتا ہوں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے دو لڑکے اَور کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک لڑکا وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا جو تعلیم الاسلام کالج میں ہے ہی نہیں۔ وہ ڈاکٹری کے لیے تیاری کر رہا تھا اور یہ تعلیم ایسی ہے جس کا ہمارے کالج میں کوئی انتظام نہیں۔ دوسرا لڑکا بہت پہلے سے اُس کالج میں داخل

تھا اور وہ بھی چونکہ ڈاکٹری کلاس میں داخل ہوا تھا اس لیے تعلیم الاسلام کالج میں داخل نہ ہو سکا۔ بہرحال دو لڑکے بعض دوسرے کالجوں میں پڑھ رہے ہیں اور ان کا خرچ خوراک ستّر روپیہ ماہوار ہے۔ ہمارے گھر میں زیادہ سے زیادہ 35 روپیہ کے قریب ایک آدمی کا خرچ بنتا ہے اور اس میں ہم بہتر سے بہتر خوراک استعمال کر رہے ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان کا کھانا ہمارے کھانے سے زیادہ اچھا ہوتا ہو۔ یہ خرچ بھی لاہور مسافرانہ زندگی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ قادیان میں تو پندرہ سولہ روپیہ ماہوار خرچ ہوتا تھا۔ اس سے پہلے دس روپیہ ماہوار ہوا کرتا تھا۔ آخر میں جب ہم وہاں سے چلے ہیں تو اُس وقت بیس روپیہ کے قریب خرچ ہوتا تھا۔ لیکن یہاں کالج میں ستّر روپیہ فی لڑکا خوراک پر خرچ کیا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں یہ حالت تھی کہ کہا جائے کہ فلاں شخص ستّر روپیہ اپنی خوراک پر خرچ کر رہا ہے تو لوگ کہتے بڑا لاٹ صاحب ہے مگر آج ہر کالج کا طالبعلم یہ خرچ ادا کر رہا ہے۔ لیکن اس خرچ کے باوجود مَیں سمجھتا ہوں انہیں وہ خوراک نہیں مل رہی جو اتنے روپیہ میں انہیں ملنی چاہیے۔ تعلیم الاسلام کالج والے دیانتداری سے کام لیں تو اس سے کم روپیہ میں ان کے ماہوار اخراجاتِ خوراک کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک پروفیسروں کا فرض ہے کہ وہ تمام اخراجات پر کڑی نگرانی رکھیں اور کسی قسم کا ناجائز خرچ نہ ہونے دیں۔ میں نے دیکھا ہے اگر پُھلکے پکانے والے کی ہی نگرانی کرو تو ستّر فیصدی آٹے میں گزارہ ہو جاتا ہے اور اگر نگرانی چھوڑ دو تو سو فیصدی آٹا خرچ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گوشت وغیرہ کے متعلق احتیاط کی جا سکتی ہے۔ اگر وہ توجہ کریں تو اس خرچ کو یقیناً کم کیا جا سکتا ہے مگر خرچ کم کرنے کے یہ معنے نہیں کہ لڑکوں کی صحت کو تباہ کیا جائے۔ ان کی صحت کو خراب کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تھوڑے روپیہ سے بہتر سے بہتر کھانا ان کو مہیا کرو اور انہیں اچھی غذا دو تا کہ ان کے دماغ اور اعصاب کو طاقت حاصل ہو اور وہ اپنی قوم کے لیے مفید وجود ثابت ہوں۔

اسی طرح دینیات کی تعلیم کی طرف اِنہیں خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ اگر دینی باتیں سننے کا لڑکوں کو زیادہ موقع ملے تو یہ لازمی بات ہے کہ ان کے اندر دینی روح بھی ترقی کرے گی اور اگر کم موقع ملے تو دینی روح کی ترقی میں بھی کمی واقع ہو جائے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس طرف کالج کے عملہ کو پوری توجہ نہیں۔ مثلاً لڑکوں کے اندر صحیح دینی جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرکز سے وابستہ ہوں۔ اور مرکز سے وابستگی پیدا کرنے کے جہاں اَور کئی طریق ہیں وہاں ایک یہ بھی طریق ہے کہ

خلیفۂ وقت سے کالج میں کم سے کم دو چار لیکچر سالانہ کروائے جائیں تاکہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو اور قربانی کی روح ان کے اندر ترقی کرے۔ اس کے علاوہ جماعت کے دوسرے علماء اور مبلغین سے بھی وقتاً فوقتاً لیکچر کروانے چاہییں تاکہ بار بار ان کے سامنے مختلف دینی مسائل آتے رہیں اور ان کی اہمیت ان کے ذہن میں راسخ ہوتی چلی جائے۔ خالی کتابیں پڑھا دینے سے دماغی تربیت نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر جرأت، ہمت اور بہادری کا مادہ پیدا کیا جائے۔ اور جرأت کا مادہ ہمیشہ ایسے لوگوں کے ذریعہ ہی پیدا ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں کوئی نمایاں کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ جب انسان ان کی باتیں سنتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ صرف منہ کی باتیں نہیں بلکہ ان کے ساتھ عمر بھر کا تجربہ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد وہ ضد کر کے بیٹھ جائے تو اَور بات ہے ورنہ اگر اس کے دل میں ذرہ بھر بھی صداقت کا احساس ہو تو وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً جب ایک شخص کہتا ہے کہ اگر میں دین کی خدمت کروں تو روٹی کہاں سے کھاؤں تو اس کا صحیح جواب وہی شخص دے سکتا ہے جس نے ساری عمر دین کی خدمت کی ہو، جس نے ساری عمر دنیا کا کوئی کام نہ کیا ہو اور پھر خدا تعالیٰ نے ہمیشہ اسے باعزت رزق دیا ہو۔ جب ایسا شخص اس سے گفتگو کرے گا اور کہے گا کہ میں نے دین کی خدمت کی ہے اور ایسے حالات میں کی ہے کہ میرے لیے روٹی کا کوئی امکان نہیں تھا مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے روٹی دی تو اس کا حوصلہ بلند ہو جائے گا اور وہ سمجھے گا کہ اگر میں بھی دین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دوں تو میں بھوکا نہیں مر سکتا۔ اسی طرح جب ایسا شخص ان سے گفتگو کرے گا جس نے خدا تعالیٰ سے باتیں کی ہوں گی، جس کی تائید کے لیے اس نے معجزات ونشانات دکھائے ہوں گے، جس پر اس کے فضل بارش کی طرح برسے ہوں گے تو اس کی گفتگو کا جو نتیجہ ہوگا وہ ان لوگوں کی گفتگو سے بالکل مختلف ہوگا جن کے ساتھ خدا تعالیٰ کا کوئی معجزانہ سلوک نہیں ہوتا اور جو محض لوگوں کے قصے اور کہانیاں سنانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص اگر یہ بیان کرے کہ احمدی غیر ممالک میں اس اس طرح قربانیاں کر رہے ہیں تو لوگوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا لیکن اگر امریکہ یا افریقہ سے کوئی شخص آکر اپنے مشاہدات کا ذکر کرے تو اس کا بالکل اَور اثر ہوتا ہے اور لوگوں کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔

بہرحال ہمارے کالج کے افسروں کے اندر یہ احساس ہونا چاہیے کہ انہوں نے اپنے طالبعلموں کی زندگیوں کو سنوارنا اور انہیں قوم کے لیے اعلیٰ درجہ کا وجود بنانا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جس محکمہ میں بھی جائیں اس میں چوٹی کے آدمی ثابت ہوں اور کوئی دوسرا شخص ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہم اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور پھر لوگوں کی مخالفت اور ان کا عِناد اس کے علاوہ ہے۔ اگر ہم کسی وقت ترقی کرتے کرتے 1/1000 سے 1/100 تک بھی پہنچ جائیں تب بھی وہ جماعت جو ایک فیصدی ہو وہ ننانوے فیصدی لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور جبکہ تعداد کے لحاظ سے ہم کسی صورت میں بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کیوں نہ ترقی کر کے ہم میں سے ہر شخص چوٹی کا آدمی بننے کی کوشش کرے۔ اور کیوں ہم اپنے اندر اتنی قابلیت اور لیاقت پیدا نہ کر لیں کہ جس وقت کوئی دوسرا شخص یہ سنے کہ یہ احمدی انجنیئر ہے یا احمدی ڈاکٹر ہے یا احمدی وکیل ہے یا احمدی بیرسٹر ہے یا احمدی تاجر ہے تو وہ کسی انٹرویو کی ضرورت ہی نہ سمجھے بلکہ محض ایک احمدی کا نام سنتے ہی یقین کر لے کہ اس شخص کا اپنے فن میں کوئی اَور مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر یہ چیز ایسی ہے جو کالج کی مدد کے بغیر ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس کالج کے عملہ کو میں خاص طور پر اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ لڑکوں کی علمی، اخلاقی اور مذہبی تربیت کی طرف توجہ کریں۔ جس طرح میں نے کہا ہے کہ انہیں لڑکوں کی خوراک کے معاملہ میں خاص طور پر نگرانی رکھنی چاہیے اسی طرح کالج کے عملہ کو لڑکوں کی تربیت میں اس قدر دلچسپی لینی چاہیے اور اس قدر توجہ اور انہماک کے ساتھ انہیں یہ کام کرنا چاہیے کہ ہر شخص کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ لڑکوں کو کسی غیر کا بیٹا نہیں بلکہ اپنا بیٹا سمجھ کر تعلیم دے رہے ہیں اور ان کی تربیت کا خاص خیال رکھ رہے ہیں۔ اسی طرح مار پیٹ اور جھڑکیاں دینے کی بجائے انہیں بچوں سے محبت اور پیار کا سلوک کرنا چاہیے۔ جب وہ بچوں کے لیے اس قسم کی محبت اور پیار کا نمونہ دکھائیں گے تو اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر ان کے دلوں میں بھی یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ جب یہ لوگ ہماری خاطر مر رہے ہیں تو ہم اپنی خاطر کیوں نہ مریں اور ہم اپنی زندگیوں میں وہ تغیر کیوں پیدا نہ کریں جو ہمارے رب کے منشا کے مطابق ہو۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ وقت دینی کاموں میں صَرف کریں گے اور رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اچھا شہری بنانے کی کوشش کریں گے۔

اِسی سلسلہ میں ایک اَور نصیحت کالج کے عملہ کو یہ کرنا چاہتا ہوں کہ انہیں لڑکوں کی دماغی تربیت

کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ان کا صرف اچھے نمبروں پر پاس ہو جانا کافی نہیں بلکہ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی دماغی تربیت اس رنگ کی ہو کہ جب وہ نماز پڑھیں تو عقلمند انسان کی طرح نماز پڑھیں اور جب کتاب پڑھیں تو عقلمند انسان کی طرح کتاب پڑھیں۔ یہ ایک الگ مضمون ہے کہ عقل اور ذہانت کی ترقی کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں اس وقت صرف اصولی طور پر اس امر کی طرف کالج کے عملہ کو توجہ دلاتا ہوں۔ اگر وہ ان امور کا خیال رکھیں گے تو لوگوں کے اندر خودبخود یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ کالج اپنے اندر بعض نمایاں خصوصیات رکھتا ہے جن سے ہمیں اپنے بچوں کو محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

اب میں اپنے خطبہ کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ لاہور کی جماعت بھی اور بیرونجات کی جماعتیں بھی اپنی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے اپنے لڑکوں کو تعلیم الاسلام کالج میں داخل کرنے کی کوشش کریں گی اور کالج کے پرنسپل اور پروفیسر بھی جنہوں نے مجھ سے درخواست کر کے یہ چاہا ہے کہ میں لوگوں کو یہ تحریک کروں کہ وہ ان کے لیے اپنی اولاد کی قربانی کریں اپنے اندر زیادہ سے زیادہ قربانی کا مادہ پیدا کر کے لڑکوں کی تعلیم کو اعلیٰ معیار تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ جب ایک طرف وہ لوگوں سے قربانی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف میرا بھی حق ہے اور دوسرے لوگوں کا بھی حق ہے کہ وہ ان سے یہ کہیں کہ آپ بھی کچھ قربانی کریں تا ہماری اور آپ کی قربانیاں دونوں مل کر نیک نتائج پیدا کریں اور ہماری آئندہ نسلیں اسلام کی فدائی اور اس کا جاں نثار گروہ ثابت ہوں۔ وَآخِرُ دَعْوٰنَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "۔

(الفضل 14 ستمبر 1949ء)

---

1 : الفاتحة: 6

2 : يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحريم: 7)

3 : تفسیر روح المعانی از علامہ الوسی۔ سورۃ المائدۃ آیت 3 جلد 3 صفحہ 233۔ بیروت لبنان 2005ء

4 : سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح: 30)